بال جبریل کی ایک رباعی

ایک سلسلہ گفتگو

مقرر
احمد جاوید

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا، کیا تو مرا ساقی نہیں ہے

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

اس قطعے کا شمار اقبال کے ان قطعات میں ہوتا ہے جو زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اللہ سے ایک زندہ مکالمے کی فضا میں بندہ گویا برابری کی سطح پر اپنے رب کو مخاطب کر رہا ہے ـــــ یہ منظر اس قطعے میں صاف نظر آتا ہے۔ یہیں نہیں بلکہ اقبال کی شاعری میں جا بجا مکالمے کی یہ فضا موجود ہے۔ کہیں جذبۂ بندگی کے ساتھ، کہیں عارفانہ ٹھہراؤ کے ساتھ، کہیں عاشقانہ جوش کے ساتھ، کہیں مناجاتی انداز سے، اور کہیں شکوے کے رنگ میں۔ اقبال تقریباً ہر رخ سے خدا کو مخاطب کرتے ہیں، اور ہر طرح کے خطاب میں ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو ہماری شعری روایتوں میں انھی سے خاص ہے۔ یہ بے تکلفی، خصوصاً شکوے کے وقت، چونکہ اللہ اور بندے کے تعلق کے معروف اسالیب اور روایتی حدود سے باہر کی چیز ہے تو اس سے مانوس ہونے میں، اور اسے سمجھنے میں خاصی دقت محسوس ہوتی ہے۔ یہ قطعہ بھی ایک زور دار شکوہ ہے اللہ سے۔ اس میں بھی قاری، خصوصاً مذہبی ذہن رکھنے والا قاری، انھی مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ یہ مشکلات چونکہ ایمانی شعور کو face کرنی پڑتی ہیں، اس لیے اس قطعے کے معنوی اور جمالیاتی پہلوؤں کی طرف متوجہ ہونے کا اسے راستا نہیں ملتا۔ کیونکہ کوئی شعری بیان اگر کسی مخاطب کے شعور میں وحشت اور اضطراب پیدا کر دے تو اس حالت میں اس بیان سے جمالیاتی تسکین حاصل کرنا خاصا دشوار ہو جاتا ہے۔ اقبال کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بندے اور خدا کے تعلق کو اس وقت تک حقیقی اور بامعنی نہیں گردانتے، جب تک اس تعلق کے دنوں اطراف ـــــ یعنی خدا اور بندہ ـــــ پوری فعالیت کے ساتھ ایک دوسرے کی ضرورت نہ ہوں۔ دونوں فعال ہوں، دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری ہوں، دونوں کو دوسرے کی ضرورت کا ادراک اور احساس ہو، اور یہ ادارک و احساس عملاً نتیجہ خیز بھی ہو۔ بظاہر یہ پورا تصور، اس تصورِ خدا سے بہت مختلف ہے جس سے ہم مانوس ہیں، اور جو ایمانی شعور کا بنیادی مسلمہ اور حال ہے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کی کوشش ضروری ہے تاکہ اس قطعے کی معنویت اور کیفیت کو سمجھا اور محسوس کیا جا سکے۔

اللہ کے ساتھ تعلق کی ایک فطری، بلکہ نفسیاتی ساخت بھی ہوتی ہے جو اللہ کے بنائے اور بتائے ہوئے معیارِ بندگی پر پوری اتر جائے تو اسی کو 'روحانی' کا عنوان دیا جاتا ہے۔ لیکن ابھی تعلق باللہ کی روحانی انتہا پر بات نہیں کرتے، اس کی نفسیاتی بناوٹ تک ہی محدود رہتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھیں تو تعلق میں

شدت، شکایت سے کچھ ایسی مناسبتیں رکھتی ہے جو تشکر کے عمل اور حال میں بھی کم ہی پائی جاتی ہیں۔ یہاں یہ خیال رہے کہ تشکر کو ہم محض نفسیاتی معنی میں استعمال کر رہے ہیں، دینی اور شرعی مفہوم میں نہیں۔ ورنہ تو ساری بات خطرناک حد تک غلط ہو جائیگی۔ تو بہر حال، نفسیاتی نکتہ یہ ہے کہ تشکر تعلق کا وہ ثمر ہے جسے پا لینے کے بعد مزید کی طلب ماند پڑ جاتی ہے۔ مطلب، نفسیاتی اور طبعی سطح پر کمزور پڑ جاتی ہے، اور وہ اضطراب بھی باقی نہیں رہتا جو مسلسل آگے بڑھتے رہنے کا تقاضا کرتا ہے۔ جبکہ یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف خدا ہے، جس کے دینے کی قوت لامحدود ہے، اور دوسری جانب بندہ ہے، جس کا کشکول کبھی نہیں بھرتا۔ اس میں لینے کی غیر محدود صلاحیت ہے۔ بندہ چاہتا ہے کہ خدا دیتے وقت میری اس صلاحیت کے مطابق مجھے عطا فرمائے۔ میں اس کی لامحدود فیاضی، اور اس فیاضی کے لامتناہی تسلسل کا ساتھ دے سکتا ہوں، کیونکہ میری طلب اور ضرورت بھی غیر محدود ہے۔ اس طلب میں ایک تخلیقی رو بھی چلتی رہتی ہے جو نئی نئی آرزوئیں ایجاد کرتی جاتی ہے۔

انسان کے اس تصور کے ساتھ تعلق باللہ کا جو نظریہ قائم ہو گا، اس میں بندہ کسی حاصل پر قانع نہیں رہے گا، کسی منزل پر اپنا سفر تمام نہیں کرے گا۔ کوئی مطلوب ایسا نہیں ہے جسے حاصل کر کے طلب کی تکمیل ہو جائے، بلکہ مطلوب جتنا حاصل ہوتا جائے گا، طلب اتنی بڑھتی جائے گی۔ یہ ایسا تعلق ہے جس میں قرب کا ہر مرحلہ شکر کو پیدا کرنے کے ساتھ اگلے مراحلِ قرب کے فقدان کو ابھار کر 'شکایت' کے جذبے کو حرکت میں لے آتا ہے۔ یہ شکایت، اللہ پر اسی یقین سے جنم لیتی ہے، جو شکر کو پیدا کرتا ہے۔ بلکہ شدت تعلق کے پہلو سے یہ 'شکایت' تشکر سے زیادہ با معنی ہے۔ تو ایک آدمی اپنے آپ کو مزید اکرام، مزید انعام، مزید عطاؤں کے لائق سمجھتے ہوئے، جو انعامات مل چکے ہیں ان کو جاننے، شکر گزاری سے قبول کرنے کے باوجود مزید انعامات کو شکوے کے ذریعے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو یہ اس کا مضمون ہے، اور یہ اقبال کا اللہ کے ساتھ مزاجِ تعلق ہے۔ اس میں انتہائے قرب کا اعتماد شامل ہے۔ نیز یہ کہ جو نفسیاتِ تعلق ہم سب میں مشترک ہے، اگر اس کی رو سے بھی دیکھیں تو جتنا تعلق بڑھتا جائے گا، اتنا ہی شکایتوں کے زور میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ ایسی شکایتیں جو مزید جوڑنے کا کام کریں گی۔ اس نفسیاتِ تعلق کو اقبال نے اللہ اور بندے کے تعلق پر بھی اطلاق کر کے دکھایا ہے۔ اب وہ فقرہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ دینے والے کا دینا بھی نامحدود ہے اور لینے والے کا لینا بھی لامحدود ہے۔ بس اس پس منظر میں اس کو دیکھیں کہ ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے۔

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا، کیا تو مرا ساقی نہیں ہے

کیونکہ میرا ساقی ہونے کے لیے شرط ہے کہ اس کے پاس شراب ہمیشہ موجود رہے۔ تو یہ جو تعطل آ گیا ہے میرے پیالے کے بھرنے میں، تو اس کی وجہ سے میں فیصلہ نہیں دے رہا، میں اپنے استعجاب کو ایک گلہ مندی کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ تعجب ہے کہ تیرے شیشے میں مے باقی نہیں! اور وہ مے باقی نہیں ہے جو تو نے صرف میرے لیے رکھی ہوئی ہے۔ ''مرا ساقی'' میں جو ''مرا'' کا لفظ ہے وہ یہ بتاتا ہے کہ یہ جو ''مے'' ہے، یہ صرف میرے لیے ہے۔ تو کہہ رہے ہیں کیا تو نے مجھے بھی دیگر رندوں کی طرح سمجھ لیا ہے جو دو چار پیالے بھر کے سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں، جن کو اپنا پیالہ خالی ہوتا برا نہیں لگتا۔ تو نے مجھے ان لوگوں میں سمجھ رکھا ہے! یہ ذہن میں رہے کہ ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے، یہ محال تصور ہے، یعنی باقی ہے۔ اگر یہ کہہ دیتے کہ تیرے شیشے میں مے باقی ہے تو اس میں اتنا زور نہ ہوتا جتنا اس میں ہے۔ اس مصرعے کا مطلب ہے کہ یقیناً باقی ہے، بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے، یقیناً تو ہی مرا ساقی ہے۔ یہ اس کا مطلب ہے۔

ان دو مصرعوں میں الفاظ کا تنوع اور لہجہ بدل کر بعض لفظوں کو پڑھنے کی گنجائش بہت ہے۔ مثال کے طور پر ''ترے'' کو خوب کھینچ کر اور تعجب کے لہجے میں ادا کیا جائے تو پورا قطعہ ایک خاص معنوی اور کیفیاتی ساخت بنا لیتا ہے ــــ یعنی یا اللہ! یہ کیسے ممکن ہے کہ تیرے، ہاں تیرے شیشے میں مے باقی نہ ہو۔ یہ تو تشنگی کی انتہا کو بھی پہنچ کر نہیں سوچا جا سکتا۔ اسی طرح ''ترے'' کو سادہ انداز سے ادا کر کے ''شیشے'' کا لفظ تھوڑا سا کھینچ کر پڑھا جائے تو اس سے بھی اس قطعے کا معنوی اور کیفیاتی کُل تو وہی رہے گا لیکن اس میں کچھ نئے اجزا بھی داخل ہو جائیں گے۔ یونہی ''مے'' کے ساتھ بھی کر کے دیکھیں۔ اسے stress word سمجھ کر ادا کریں اور پچھلے الفاظ کو عام لحن ہی سے پڑھیں۔ ''مے'' کو تاکید اور پھیلاؤ کے ساتھ ادا کرنے سے یوں محسوس ہوگا جیسے خدا کے حضور میں انسان اپنی حقیقت، کمال اور احتیاج کے ساتھ حاضر ہے۔ اور بس اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ احساس بھی ہوگا کہ ''مے'' خدا احوالی کا سرچشمہ ہے جس سے انسان اپنے حقائقِ بندگی کو عارف اور عاشق بن کر experience کرتا ہے۔ ایسے ہی ''باقی نہیں ہے'' کو کھینچ کر اور اچنبھے کے ساتھ زبان سے کہہ کر دیکھیں تو یوں لگے گا جیسے پورا نظامِ وجود، عدم کے اندھیرے میں ڈوب جانے کو ہے۔ معدومیت کا ایک طوفان ہے جو اٹھنے کے انتظار میں ہے۔ ''نہیں ہے'' کے ٹکڑے میں جو ڈراؤنا پن ہے وہ سوال و جواب

کی معروف صورتوں اور حالتوں سے ماورا ہے۔ ہر موجود و معدوم اس کے دائرے میں سمایا ہوا ہے، اور خود یہ ''نہیں ہے'' کسی دائرے میں محدود نہیں ہے۔ یہ ذرا شاعرانہ سا فقرہ ہو گیا، لیکن خیر کوئی بات نہیں، ہم بہر حال شاعری ہی پڑھ رہے ہیں۔ غرض اسی طرح لفظوں کی ادائی میں، اور اپنے لہجے میں تنوع پیدا کر کے اس قطعے کے مختلف احوال کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ احوال محسوس ہو جائیں تو معانی میں بھی جان پڑ جاتی ہے، اور ان کی مختلف جہتیں بھی باہمی مناسبت اور ٹکراؤ کے ساتھ سامنے آ جاتی ہیں۔ ارے یاد آیا، دوسرے مصرعے میں ''مرا'' کا لفظ بھی بہت بامعنی اور کیفیت انگیز ہے۔ ''مرا'' کو بھی کم و بیش اسی آہنگ میں recite ہونا چاہیے جس آہنگ میں پہلے مصرعے میں ''ترے'' کو پڑھا جائے۔ جس طرح ''ترے'' میں اللہ اپنے شکوہ و جلال اور جمال و کمال کے ساتھ دل اور ذہن کو اپنی طرف یکسو کرتا ہے، اور بندہ انکشاف اور حضور کی حالت سے خود کو گزرتے ہوئے محسوس کرتا ہے، اسی طرح ''مرا'' کی گونج اور وسعت میں پورا انسان اپنے تمام حقائق اور کمالات سمیت حاضر ہو جاتا ہے۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

یہاں جو ہے 'مے' کو سمجھ لینا چاہیے تو یہ سب کچھ کھل جائے گا۔ اقبال حضور خداوندی میں یہ عرض کر رہے ہیں کہ ایک تو مجھے وہ شعور عطا فرمائیے جو میری حدود و قیود بھی متعین کر دے، آپ کی شناخت بھی فراہم کر دے۔ 'مے' پہچان دیتی ہے اپنی، اور جس نے بنائی ہے، جس نے پلائی ہے، اس کی۔ ساقی کو جاننے کے لیے رندی ضروری ہے اور اپنے آپ کو جاننے کے لیے بھی کہ ہم کیا ہیں؟ ہم وہ وجود ہیں جس کی معروضی تعریف متعین ہے، یعنی ہمیں define کرنے میں زیادہ کردار ہماری حقیقت کے شعور کا نہیں ہے، ہماری عملی وضع و حیثیت، ہماری فعلیت کا ہے۔ ہم اپنے معروض سے define ہوتے ہیں۔ تو اس تعریف و حد بندی کی تنگنائی کو شراب توڑ دیتی ہے، یعنی شراب ہماری معروضی تعریف کو توڑ دیتی ہے۔ ہماری تعریف ہمارے لیے بھی متعین کرتی ہے، اور اپنے پلانے والے کی شناخت اور تعریف بھی فراہم کرتی ہے۔ کیونکہ جو تعلق ایک رند اور ساقی کا ہوتا ہے، وہ براہ راست ہوتا ہے۔ تو 'مے' کو بہ اعتبارِ معنی دو تین مرحلوں میں دیکھنا چاہیے۔ پہلا مطلب ہے اپنا شعور اور تیرا شعور، جو تو فراہم کرے گا، میں اسے قبول کر کے استعمال کروں گا۔ دوسرا مطلب ہے کہ میری تمنا ہے کہ مجھے وجود کا وہ حال نصیب ہو جو تیرے وجود کا ذوقی تجربہ کروا دے۔ میں وجود کے ایسے حال کا طالب ہوں جو حال تیری ملکیت ہے۔ وہ حال مل جائے تو میں انسان ہونا بھی تجربہ کر لوں اور تیرا خدا ہونا بھی میرا تجربہ بن جائے، خدا ہوئے بغیر۔ ساقی اور رند کی تفریق اس قطعے میں

آخر تک باقی ہے، تو خدا ہوئے بغیر خدا کے ہونے کا ذوقی تجربہ کر لینا، یہ حال ہے۔ تیسرا میرا یہ مطالبہ ہے کہ میرا شعور اور نظمِ وجود یکساں نہیں ہے۔ کیوں یکساں نہیں ہے؟ کیوں کہ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ میں نہیں ہوں۔ میرا معلوم، میرا غیر ہے۔ یہ قید مجھ پر اتنی سختی سے لگا دی گئی ہے کہ میں جتنا خود اپنے آپ کو معلوم ہوں، میں خود بھی اپنا غیر بن جاتا ہوں۔ میں اپنے علم میں آتے ہی اپنا غیر بن جاتا ہوں۔ یہ ذرا سی باریک بات ہے۔ تو انسانی علم اور شعور کی بناوٹ ایسی ہے کہ اس کا ہر مشمول انسان کا غیر بن جاتا ہے، یعنی ہمارا علم غیریت کو متحقق (realize) کرواتا ہے۔ غیریت کو لزوم دیتا ہے، غیریت کو اصول بناتا ہے، اور یہ اصول اتنا مضبوط، ہمہ گیر اور بے لچک ہے کہ میں خود جتنا اپنے علم میں ہوں، اتنا ہی اپنا غیر ہوں۔ تو اس مسئلے سے اپنی جان چھڑانے کے لیے، اس انتہائی بڑے المیے سے خود کو نکالنے کے لیے میری تمنا یہ ہے کہ یا اللہ میرے شعور اور وجود کو عینِ یکدگر (identical) کر دیجیے۔ 'مے' وہ وسیلۂ شناخت، ذریعۂ خود شناسی ہے جو شعور اور وجود کو identical بنا دیتا ہے۔ کیوں بنا دیتا ہے؟ 'مے' کہتے کسے ہیں روایتی طور پر؟ معنی کا حال بن جانا، حال ہی کا معنی بن جانا۔ 'مے' کیا ہوتی ہے! معنی کو حال بنا دیتی ہے، حال کو معنی بنا دیتی ہے۔ تو معنی کا حال یا حال کا معنی بن جانا، دراصل شعور اور وجود کا ایک ہو جانا ہے۔ غیریت کا یہ جبر جو ہے، اگر یہ اٹھ جائے تو میرے وجود کی نشوونما کے احکامات اسی طرح غیر محدود ہو جائیں گے جس طرح غیر محدود امکانات پر مجھے پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ ساقی بن کر۔ اللہ ساقی بن کر جو مجھ پر فیضان کرتا ہے، اس فیضان میں ان تینوں مطالبات کی تکمیل موجود ہے۔ تو اقبال یہ کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ وہ شراب جو ہے، کیا وہ آپ کے شیشے میں باقی نہیں رہی! کیونکہ میرے مسئلے تو وہی ہیں۔ میرا علم بھی بڑھ رہا ہے، میرا تجربہ بھی بڑھ رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ احساس غیریت بھی بڑھ رہا ہے۔ تو اب ان تینوں مطالبات کو ذہن میں رکھیے۔ ان تینوں مطالبات کی تکمیل کا ذریعہ ''مے'' ہے۔ اقبال کہہ رہے ہیں کہ کیا اب تو وہ فیضان نہیں فرما رہا میرے اوپر۔ مراد یہ ہے کہ اب کیا وہ فیضان مجھ پر نہیں ہو رہا۔ مجھے تو خلق ہی تو نے کیا تھا اس فیضان کی قبولیت دے کر۔ تو اب کیا تو اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا نہیں کرے گا؟ تو فیضان ایک بہت اہم لفظ ہے۔ تصوف کی بڑی اہم اصطلاح ہے جو الوہی معاملات میں بھی استعمال ہوتی ہے اور مخلوق کے درجے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ تو مانگنے کا سب سے مؤثر طریقہ کیا ہوتا ہے جوش دلانا۔ یعنی یہ کہ تو میری مدد نہیں کر سکتا۔ اس کو اس رنگ میں دیکھیے تو چیزیں بہت زیادہ مؤدبانہ محسوس ہوں گی۔ یہ وہ جگہیں ہیں جہاں اقبال نے عشق اور ادب کو یکجان کیا ہے عشق کے غلبے کے ساتھ۔ یہ ایک بہترین قوام ہے کہ بندگی عشق اور ادب کا مجموعہ ہے۔ بعض لوگوں میں عشق ادب پر غالب ہو جائے تو بھی وہ بندگی کی حقیقت پر کھڑے ہیں۔ بعض لوگوں میں ادب عشق پر

غالب آ جائے تو وہ بھی بندگی کی دوسری حقیقت اور دوسرے موقف پر کھڑے ہیں۔ تو یہ وہ موقف ہے جہاں آدمی کا عشق ادب پر غالب ہے۔

وہ کہتے ہیں نا ''ہر شوق نہیں گستاخ''، تو کون سا شوق گستاخ نہیں ہے؟ جو ادب سے خالی ہے۔ وہ مثبت معنوں میں گستاخ نہیں ہے، منفی معنی میں گستاخ ہے۔ تو مانگنے کا مطلب ہے دینے والے کے لیے اپنی تمنا کو پرکشش بنا دینا۔ دینے والا آپ کی تمنا سے خوش ہو جائے۔ اپنی تمنا کو پرکشش بنانے کے یہ سارے جتن کیے جا رہے ہیں۔ 'ساقی' وہ ذات ہے، وہ وجود ہے جو اپنے آپ کو بھی ظاہر کرتا ہے اور جس کو شراب دے رہا ہے، خود اسے بھی اس پر ظاہر کرتا ہے۔ یعنی ساقی اور رند میں ساقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے نا۔ تو ساقی کون ہے۔ وہ شراب دیتے ہوئے خود ظاہر ہوتا ہے اور شراب پلا دینے کے بعد وہ رند پر اپنی معرفت یعنی رند کو خود اپنے آپ سے آشنائی کے انتہائی مراحل بھی طے کروا دیتا ہے۔ تو ساقی وہ ہے جو خود کو ظاہر کرے اور دوسرے کو بھی خود اس پر ظاہر کر دے، اور جس کا ظہور مشروط ہو ناظر کے ظہور سے۔ اب یہ پوری بات ہو گئی کہ جس کا عرفان مشروط ہو ناظر کے عرفان سے، وہ ساقی ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ کی معرفت کی شرط ہے معرفتِ خویش۔ تو اس کی اپنی معرفت یعنی اللہ کی معرفت کا اندازِ حصول معرفتِ نفس کے اسلوب میں ہی ہو گا، ورنہ نہیں ہو گا۔ اب آپ سوچیں کہ یہ کتنا بڑا فیضان ہے کہ اللہ یعنی حقیقت الحقائق اپنی معرفت کو مشروط کر رہا ہے، ہم رنگ کر رہا ہے، ہم حال کر رہا ہے معرفتِ نفس سے۔ تو اس پورے عمل کا نتیجہ شعور اور وجود کا عین ہونا نہیں نکلے گا! اس پورے عمل کا نتیجہ وجود کے پورے مظاہر کی ہم احوالی کی شکل میں برآمد نہیں ہو گا؟ اسے ذرا اور کھولیے تھوڑے سے شاعرانہ انداز میں۔ ساقی کہتے ہیں غیاب کو حضور سے بدلنے والا۔ اپنے غیاب کو بھی، میرے غیاب کو بھی۔ اس پر ذرا سا غور کیجیے گا۔ شراب کہتے ہیں وہ چیز جو بے حضوری کو حضوری بنا دے۔ ساقی کا غیاب بھی حضور میں بدلے اور پینے والے کی بے حضوری کو بھی حضور میں بدلے۔ تو حضور ہی نام ہے شعور اور وجود کی یکجائی کا۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم

بات آگے بڑھانے سے پہلے ایک چیز عرض کر دوں کہ اقبال کے یہاں مصرعوں میں ربط بہت گہرا اور مضبوط ہوتا ہے۔ طویل نظمیں ہوں یا قطعات وغیرہ، ہر بیان میں اس کے تمام اجزا شروع سے آخر تک ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ الفاظ اور مصرعوں کا یہ آپسی جوڑ نثری انداز کا نہیں ہوتا، بلکہ اس ربط کی تعمیر میں وہ خاصی خلاقی اور چابک دستی دکھاتے ہیں۔ ان کا تقریباً ہر شعری بیان ایک مربوط بہاؤ کی طرح ہوتا ہے جس میں مضمون کا تسلسل، تصویروں کی حرکت اور آوازوں کی ہم آہنگی، یہ سب کارفرما ہوتے ہیں۔ اس

سلسلے میں اقبال کی ایک تکنیک یہ ہے کہ وہ اکثر مقامات پر مصرعوں میں ایسا ربط پیدا کرتے ہیں جس میں اگلا مصرع پچھلے مصرعوں کے تمام معانی کو اپنے اندر سموئے ہوئے نہیں ہوتا بلکہ اس طریقے سے ہوتا ہے کہ اگر ایک مصرعے میں چار معانی بیان ہوئے ہیں تو اگلے مصرعے میں یا اگلے شعر میں ممکن ہے کہ دو ہی معانی اظہار پائیں اور ان دو کا تعلق پچھلے معانی کے ساتھ ایسا نہ ہو کہ پڑھنے والا یہ کہہ سکے کہ بات کو دہرایا جا رہا ہے۔

اب اسی تیسرے مصرعے کو دیکھیے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ معانی کے لحاظ سے پچھلے دو مصرعوں میں بیان شدہ معنی قدرے سکڑ گیا ہے، یا اصطلاح میں کہیں تو زیادہ particularise ہو گیا ہے۔ لیکن دوسری طرف دیکھیں تو صورت (form) کے لحاظ سے تیسرے مصرعے میں ایک توسیعی عمل نظر آتا ہے۔ ''مے'' معنی میں سمندر سے زیادہ ہے، اسی طرح ''شیشہ'' بھی سمندر کے مقابلے میں زیادہ بامعنی ہے، تاہم باعتبارِ صورت، سمندر کی تصویر زیادہ بڑی ہے۔ یہ بات کہہ کر اچانک خیال آیا کہ یہ بات صرف ایک پہلو سے ٹھیک ہے، ہر پہلو سے نہیں۔ پوری بات جو ابھی ذہن میں آئی ہے، وہ یہ ہے کہ اس مصرعے میں پچھلے دو مصرعوں کے ساتھ ربط کا ایک دہرا انداز پایا جاتا ہے۔ اس کے تین کردار ہیں: سمندر، پیاسا اور شبنم۔ سمندر کی رعایت پہلے مصرعے کے ''شیشے'' کے ساتھ ہے، پیاسا دوسرے مصرعے کے متکلم کا عنوان ہے، اور شبنم مصرعے میں مذکور ''مے'' سے جڑی ہوئی ہے۔ اب ان کے درمیان مناسبتوں کے کئی پہلو ہیں جن میں سے ایک دو نمونے کے طور پر ہم نے ابھی عرض کیے ہیں۔

ہماری صوفیانہ شعری روایت میں اللہ کے ساتھ تعلق میں ایک ایسی بے تکلفی خاصی عام ہے جو ادب کو مصنوعی نہیں بننے دیتی، اور بندے کو اپنے طے شدہ حدود سے باہر نکل کر اللہ سے کلام کرنے کی ایک ایسی فضا میں لے جاتی ہے جہاں اس تعلق کے معروف تقاضے اس طرح پورے ہوتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے جس طرح اس تعلق کی احوالی اور اظہاری روایت میں ایک مرکزی دھارے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اس فضا میں بندہ یوں لگتا ہے کہ اپنی حیثیت سے تجاوز کر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود خدا کا مرتبہ کسی پہلو سے مجروح نہیں ہونے دیتا۔ اقبال، حضورِ الٰہیہ میں جہاں شکوے کا رنگ اختیار کرتے ہیں، وہاں اکثر ایسی ہی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ تاہم، اس طرح کی صورتحال میں بھی اقبال بندے کو اس کی معروف حیثیت سے بہت آگے بڑھا دینے کے باوجود اسے بندگی کے ideals سے ہم آہنگ رکھتے ہیں۔ یعنی بندگی یا آدمیت کے حقائق اور امکانات کو اس کی عملی محدودیت پر غالب کر دیتے ہیں۔ اسی عملی محدودیت کو ہم بندے کی حیثیت کہہ رہے ہیں۔ جب بندہ اپنے آدرشی وجود میں ڈھل کر اللہ سے کلام کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اپنی واقعی حیثیت سے تجاوز کرنا پڑتا ہے۔

اگر ہم بھی بے تکلفی سے کہیں تو اس قطعے میں، خصوصاً تیسرے مصرعے میں اللہ کی فیاضی کو جوش میں لانے اور ابھارنے کی کوشش کی جا رہی ہے، یعنی اللہ کے بحرِ کرم سے پیاسے بندے کو شبنم جتنی مقدار میں پانی ملے تو کہیں وہ پیاسا بندہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ سمندر بس اتنا ہی ہے، شبنم جتنا! اس پہلو سے اللہ کی جناب میں ایک عارفانہ اعتماد اور عاشقانہ اضطراب کے ساتھ عرض کیا جا رہا ہے کہ یا اللہ! تیری عطا میری طلب سے کم تو ہو نہیں سکتی، مگر اس کے باوجود کیا تو یہ چاہتا ہے کہ ہم تیرے سمندر کو شبنم مان لیں اور یہ تسلیم کر لیں ہماری طلب کی تکمیل تیری عطا سے بھی نہیں ہوگی! ظاہر ہے کہ بندگی کی انتہائی گہرائی اور پوری سچائی کے ساتھ ابھرنے والی یہ آواز اللہ سنے گا ضرور۔ وہ بھلا کب چاہے گا کہ اس کے سمندر کو شبنم سمجھا جائے اور اس کی فیاضی کو محدود جانا جائے۔ اور ہاں، یہاں ''پیاسا'' بھی بہت اہم ہے۔ پیاسا وہ ہے جو کامل سیرابی کا متمنی ہے۔ وہ جو بات میں عرض کر رہا تھا کہ دینے والے کا دینا بھی لامتناہی ہے اور مانگنے والے کا لینا بھی غیر محدود ہے، تو یہاں لینے والے کی غیر محدودیت ''پیاسا'' کے کردار میں مجسم ہو گئی ہے۔ یعنی سمندر کا پیاسا، لامحدود فیضان کو قبول کر سکنے کی صلاحیت رکھنے والا۔ اب دیکھیں، صلاحیت تو لامحدود ہے مگر جو دیا جا رہا ہے وہ بہت ہی محدود ہے۔ یہ تقابل کسی واقعیت پر قائم نہیں ہے، بلکہ ایک ایسا مبالغہ ہے جو اپنی التجا میں شدت پیدا کرنے کے لیے روا رکھا گیا ہے۔ اس اسلوب کی خاصیت یہ ہے کہ جو نہیں مانا جا رہا بظاہر اسی کو مانا جا رہا ہے، یا جو لفظوں سے مانا جا رہا ہے، معنی اس کا انکار کرتے ہیں۔ چوتھے مصرعے میں ''بخیلی'' کے لفظ کا استعمال اسی اسلوب میں کیا گیا ہے کہ میں تجھے ہرگز بخیل نہیں سمجھتا، میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی وجہ سے یا اللہ! میں تیری شانِ فیاضی تو اچھی طرح دیکھنے اور محسوس کرنے سے قاصر ہوں۔ لاریب، تو ہی رزاق ہے بس مجھے اپنی رزاقی کا تجربہ فراہم کر دے۔ یقین پہلے سے موجود ہے، بس ایک حال درکار ہے۔ یہاں رزاق سے مراد ہے رزقِ وجودی فراہم کرنے والا، کمالاتِ وجود کے تمام وسائل عطا کرنے والا۔ یعنی رزاق وہ ہے جو جود کے اقتضا اور تشنگی کی کامل اور مسلسل تسکین کرتا ہے۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم —— اس مصرعے کی خوبصورتی دیکھیے کہ کس حسنِ اظہار کے ساتھ یہ کہا جا رہا ہے کہ میں دنیا وغیرہ کا پیاسا نہیں ہوں، مجھے تو بس تیری پیاس ہے۔ آپ سمجھ گئے ناں! اس سے مضمون کی بلندی کا احساس اور ادراک ہو جاتا ہے۔ یہ غریبی، بیماری اور مصیبت زدگی وغیرہ کا شکوہ نہیں ہے بلکہ اپنی ایسی وجودی تکمیل کا تقاضا ہے جو تعلق باللہ کے عارفانہ اور عاشقانہ مقامات طے کروا دے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو اقبال کہہ رہے ہیں کہ سمندر اگر شبنم بن کر ظاہر ہوگا تو ایک طرف پیاسے کو اپنی پیاس بری لگنے لگے گی، اور دوسری جانب وہ سمندر کو بھی شبنم سمجھنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اب بھلا خدا اپنے بارے میں اس معرفت

کو جو اس کے بالکل شایانِ شان نہیں ہے، کیسے روا رکھے گا۔ سمندر کب چاہے گا کہ اسے شبنم سمجھا جائے۔ آپ نے دیکھا کہ کس صداقت اور مہارت کے ساتھ شکوے کو عاشقانہ ندا اور دعا بنا دیا گیا ہے۔ اس قطعے کو سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں جہاں ''نہیں'' کا لفظ آیا ہے اس کو اثباتی معنی میں لیا جائے، یعنی کہ تیرے ہی شیشے میں مے باقی ہے، تو ہی میرا ساقی ہے، تو ہی رزاق ہے۔۔۔